# قاضی عبدالستار کے افسانوں کا تہذیبی اور معاشرتی پس منظر

**مہناز عبید**

B-10، سیکنڈ فلور، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔110025

قاضی عبدالستار ہمارے ان افسانہ نگاروں ہیں، جنھوں نے بالخصوص (موجودہ مشرقی یوپی) کے خستہ حال زمینداروں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ زمینداری بجائے خود جاگیردارانہ نظام کی باقیات ہونے کے سبب ایک سماجی ادارے کی حیثیت سے کس قدر ضروری یا غیر ضروری تھی، خصوصاً عوامی زندگی میں ذلت وخواری اور افلاس و معاشی خستہ حالی کے تناظر میں چند افراد کی پورے معاشرتی نظام پر حکومت اور اجارہ داری بجائے خود کس قدر منصفانہ یا غیر منصفانہ تھی، یہ باتیں قاضی عبدالستار کے افسانوں کا موضوع نہیں ہیں۔ وہ شخصی طور پر خود بھی اسی نظام کا ایک حصہ رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی وابستگی کا تقاضا ہے کہ وہ اس ادارے کا دفاع، حمایت اور تائید کریں۔ چنانچہ ان کے ہاں فکشن میں فنی سطح پر جو گداز (Pathos) ملتا ہے، اس کا تعلق اسی المیہ سے ہے، جو آزادی کے بعد زمینداری کے اچانک خاتمے اور اس کے نتیجے میں اس سے وابستہ افراد کی زندگیوں کے اچانک منتشر اور برباد ہوجانے کے سبب پیدا ہوتا ہے۔

قاضی عبدالستار اس نظام کی غیر معمولی مقبولیت اور اپنے عہد کی ایک ناگزیر انسانی ضرورت تسلیم کرنے کے بعد، اس کے بطن سے پیدا شدہ ان شریفانہ اقدار کا جو دیکھتے ہی دیکھتے زمانے کے ہاتھوں پامال ہوتی چلی گئیں، شدید ماتم کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جاگیرداری کے بطن سے پیدا ہونے والا یہ ادارہ سماجی اقدار کے محافظوں اور مساوات کے شیدائیوں کے ہاتھوں ختم تو کر دیا گیا، لیکن بطور نعم البدل علاوہ پرفریب نعروں اور سہانے خوابوں کے، معاشرتی ڈھانچے کی شکست وریخت سے پیدا ہونے والے مسائل کا کوئی معقول حل نہ دریافت کیا جاسکا۔ یہ وہ درد ہے، جو قاضی عبدالستار کے افسانوں کی روح سے ایک ٹیس بن کر ابھرتا ہے اس لیے کہ جاگیردارانہ نظام کے ملبے میں کچھ زندہ انسانی اقدار اور اشخاص اب بھی باقی ہیں جو رہ رہ کر کراہتے ہیں۔ قاضی صاحب جیسے حساس فنکار کے افسانوں میں یہ حقیقتیں ایک نئی معنویت کے ساتھ عود کر آئی ہیں۔ قاضی عبدالستار نے ایک نسبتاً محدود سطح پر مشرقی یوپی کے قصبات کی حد تک اودھ کی جس تہذیب وثقافت سے اپنی کہانیوں کا مواد حاصل کیا ہے، اس کا ایک وسیع ثقافتی اور سماجی پس منظر رہا ہے یعنی اودھ کی تہذیب جس کا اصل مرکز اور گہوارہ غدر ۱۸۵۷ء کے قبل کا فیض آباد اور لکھنؤ شہر تھا اور یہ تہذیب جس دور میں پروان چڑھی اس کی ابتدا امیر محمد امین برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری (۱۷۱۹ء- ۱۷۳۹ء) سے اور اختتام محمد واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء) پر ہوتا ہے۔

اودھ کے خطے میں تقریباً ڈیڑھ سو سال تک پرورش پانے والی اس تہذیب کے کچھ خاص امتیازی نشانات رہے ہیں جن سے اس کی پہچان ہوتی رہی ہے۔ اس تمدن اور اس کی اقدار کو فروغ دینے میں اودھ کی اپنی دیسی تہذیب اور قدیم روایات کے علاوہ ایرانی اثرات اور تہذیب کے امتزاج سے ایک نئی کائنات وجود میں آئی۔ اودھ کی تہذیبی زندگی کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ شخصی حکومتوں اور سامراجی طاقتوں کے عروج کے زمانے میں حکمرانوں کی توجہ زیادہ تر ذاتی اور شخصی نمود ونمائش پر رہی ہے۔ چنانچہ اس کے مظاہرے میں افراط وتفریط کی ہزار ہا مثالیں تاریخی سفر میں موجود ہیں۔ ایسی صورت میں اودھ کا ذکر چھڑتے ہی اس کے حکمرانوں کے عیش ونشاط کا ذکر چھڑ جانا بھی ضروری ہوجاتا ہے اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پورا زمانہ اودھ کی تہذیبی تاریخ کا ایک انتہائی زوال آمادہ زمانہ رہا ہے جس میں ارباب سلطنت نے ظاہری شان وشوکت کے مظاہرے اور فضول خرچی کے سوا کوئی مفید کام سرے سے کیے ہی نہیں، حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ ان ادوار میں جہاں ایک طرف لہو ولعب کی گرم بازاری رہی ہے وہیں دوسری طرف ایک بڑے پیمانے پر بعض انسانی اوصاف واقدار اور جمالیاتی، فنی وتہذیبی سطحوں پر قابل قدر سرگرمیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

اودھ کے تہذیبی وثقافتی ماحول کے جائزے میں بہت کم لوگ جادۂ اعتدال پر گامزن رہ سکے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس طرح کی کاوشوں سے حقیقت کا صرف ایک ہی رخ سامنے آسکا ہے۔ اس کی ایک بڑی دلچسپ

مثال سید عبدالباری کی کتاب 'لکھنؤ کے شعروادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر' ہے، جس میں یک طرفہ کارروائی کے انداز میں اودھ کی جاگیردارانہ تہذیبی زندگی کا خاصا سخت محاسبہ کیا گیا ہے۔ سید عبدالباری لکھتے ہیں:

''اس عہد کی منجمد ثقافت میں زندگی کے تصور کو خیرباد کہہ دیا گیا تھا اور ایسے مشاغل پر ساری توجہات مرکوز ہوگئیں، جو انسانی شریانوں کے لہو کو بستہ بنانے والے تھے۔ نمود ونمائش اور آرائش وزیبائش کا شوق جنوں کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ جلال کو جمال پر اور استحکام وپایہ داری کو نزاکت ونفاست پر قربان کردیا گیا تھا۔ لباس نہایت ہلکے پھلکے اور نازک ولطیف چال ڈھال نہایت معشوقانہ، خورونوش میں نہایت نفاست ولطافت، زبان و لہجہ نہایت نرم وشیریں۔ غرض پوری زندگی ایک کارگہ شیشہ گری بن کر رہ گئی تھی۔ اس تمدن کے اسٹیج پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انسانوں کے بجائے موم کی پتلیاں نہایت پرتکلف ماحول میں زندگی کے ایک نشاطیہ اور رومان انگیز ڈرامے میں اپنا اپنا پارٹ ادا کررہی تھیں۔ طاقت، غلبہ واستیلا کا تصور اس معاشرے سے رخصت ہوچکا تھا۔ قہرمانی اور جاہ وجلال کی اس عہد کے مزاج پر کوئی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔ انفعالیت ومجہولیت حسن کردار بن گئی تھی۔ جانوروں کی لڑائی کے تماشے اور قدیم فنونِ حرب و ضرب کی بے مقصد نمائش بھی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کی چنگاریاں دلوں میں نہ پیدا کرسکتی تھیں۔''

منقولہ بالا خیالات اور دعووں کے ثبوت میں وہ مزید فرماتے ہیں:

''اودھ کا معاشرہ کوئی جدید معاشرہ یا اس عہد کی ثقافت نہ تھی۔ یہ اپنے بنیادی خدوخال کے اعتبار سے عہد وسطیٰ کے معاشرہ و ثقافت کی توسیع کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہندوستان کے مغل عہد حکومت کے طویل دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ربط باہم اور معاشرتی وثقافتی اختلاط میں ڈھل ڈھلا کر جو معاشرہ اور ثقافت عالمِ وجود میں آئی اور جس کی توانائی اور آب و رنگ سولہویں اور سترہویں صدی کے ہندوستان میں اکبر سے اورنگ زیب تک اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اب یہ ثقافت اپنے ارتقا کی صلاحیت کھوچکی تھی۔ قوت نمو کا فقدان ہوچکا تھا، صحت مند قدروں پر زنگ لگ چکا تھا۔ یہ ثقافت اب سالم نہ تھی۔ بکھر رہی تھی، اس کی روشن روایات اور توانا اقدار سماج میں جہاں تہاں تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے کی طرح موجود تھیں، مگر فرد کی زندگی اور معاشرہ کے اجتماعی وظائف واعمال کو شیرازہ بند کرنے اور اسے کسی اعلیٰ آدرش اور بلند مقصد کی دشوار مہم اور عظیم مشق کا متحمل بنانے سے قاصر تھیں۔ معاشرے کے کرداروں میں ہم آہنگی و باضابطگی نہ تھی۔ ان کی مختلف معاشرتی سرگرمیاں بے ربط تھیں۔''

سید عبدالباری اودھ کی تہذیبی زندگی کا جو نقشہ پیش کررہے ہیں، اس کا ایک دوسرا رخ ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ کریں:

''اس عہد کی ثقافت گو ہمہ جہتی ارتقا سے محروم تھی، لیکن ایک مخصوص رُخ پر وہ تیزی سے پیش رفت کررہی تھی اور وہ رخ تھا مادّی خوش حالی اور جسمانی لذت کا۔ اس فکر ونظر میں بھی گہرائی ناپید تھی۔ چنانچہ ساری توجہ لفاظی اور تصنع تک محدود ہوگئی۔ نسائیت، ابتذال، نمائش، سطحیت، عشق بازی، طلب وصل معاملہ بندی اور چھیڑ چھاڑ اس عہد کے شعری وادبی مزاج کا ایک ناگزیر حصہ بن گیا۔''

تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ اس عہد میں اخلاقی اقدار وروایات کے تمام چراغ گل ہوگئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ اقدار شوکیش کی زینت بن چکی تھیں اور ان کا عمل دخل فرد کی داخلی زندگی میں برائے نام رہ گیا تھا۔ امرا کے دربار، متمول طبقے کی بزم عیش، طالبان راحت ورنگ کے عشرت کدوں سے پرے، معاشرے کا ایک بڑا حصہ جو نگاہوں سے اوجھل تھا اور جو سمندر میں تیرتے ہوئے تودۂ برف کی طرح بالائی سطح کے نیچے پنہاں تھا ماضی کے سرمایۂ اخلاق وتہذیب کو سینے سے لگائے تھا کہ عیش ونشاط میں غرق طبقۂ امرا میں کبھی جب کوئی اپنی خودفراموشیوں میں کسی ٹھوکر سے چونک پڑتا اور اسے اپنے سود وزیاں کا حساس ہوتا تو وہ راہ راست پر آنے کی کوشش کرتا تھا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ جملہ غیر مطبوع رجحانات کے باوجود اس عہد کے ادب میں اقدار کے جھلملاتے ہوئے ستارے ہر جگہ نظر آتے ہیں، ہاں ماحول کی تاریکی ان ٹمٹماتے ہوئے تاروں پر حاوی ہے— ان ستاروں کو حیرت اور ایک نگاہ عقیدت کے ساتھ دیکھ تو لیا جاتا تھا تاہم ان میں رہنمائی کرنے یا زندگی کی شب تاریک کو روشن کرنے کی تاب نہ تھی۔ سید عبدالباری جو بالعموم اودھ کی تہذیبی وتمدنی زندگی اور ماحول میں کوئی مثبت خوبی یا حسن نہیں دیکھتے۔ درج ذیل اقتباس میں اس تہذیب کو وہ کچھ رعایت دینے کے لیے بھی تیار نظر آتے ہیں ہر چند کہ ایک سانس میں تہذیبی خامیوں اور خوبیوں کو بیان کردینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

''یوں اس عہد کی ادبی فضا میں قدم قدم پر مسکین نوازی، عفو و درگزر، ایثار، فیاضی، عیب پوشی، انتقام نہ لینا، حلم، مہمان نوازی، تحفظ عزت، صبر و ثبات، جرأت و شجاعت، اعترافِ گناہ، صداقت و دیانت، قومی حمیت، استغنا، شرم و حیا، طہارت ونظافت، پابندیِ عہد، وضع داری، عزت وخودداری اوراخوت و مساوات کے جگنو جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ اس عہد کی ثقافت نے ماضی میں معاشرے کو جو بیش بہا سرمایۂ اخلاق اور ضابطۂ کردار عطا کیا تھا، مثلاً صلہ رحمی، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک، باہمی محبت، ادب واحترام، خدمت اور سپاس گزاری، حسن ظن، مصالحت وصفائی، فرق مراتب کا لحاظ وغیرہ ہنوز باقی تھا۔ ان کی جھلکیاں اس عہد کے شعر وادب میں بھی وافر موجود ہیں۔ خصوصاً مرثیہ تو ان اوصاف سے بھرا پڑا ہے۔''

آتش اوران کے شاگردوں کے کلام میں بھی ان اوصاف کی فراوانی ہے۔ ناسخ نے لکھنؤ کے ثقافتی مزاج کو اردو شعر وادب کے مزاج کا حصہ بنادیا۔ پتہ چلتا ہے کہ عام ہیئت پرستی اور نفسانی ہوا و ہوس کے ساتھ اس ماحول میں قلندری، انسان دوستی، سادہ مزاجی اور اسباب دنیا سے بے نیازی کا ایک قوی رجحان کی حیثیت سے موجود تھا۔ بالخصوص اودھ کے قصبات میں لکھنؤ کے عام ماحول سے مختلف فضا تھی۔ اس بجھی ہوئی آگ میں بظاہر کوئی چنگاری نہ تھی۔ اس ماحول میں اگر کسی کو خزاں کی دستک سنائی پڑتی، تو اس تصور سے اس کی صدا میں درد واضطراب پیدا ہوجاتا ہے اور قہقہوں کے درمیان یہ صدا دب کر رہ جاتی ہے۔ ہمارا شاعر تخیل وتصور کے ایسے ایسے گل بوٹے کھلاتا کہ کسی کو خزاں کا دور، دور تک احساس تک نہ ہوتا۔

ڈاکٹر عبدالباری لکھتے ہیں:

''یہاں گرچہ قدریں تبدیل نہیں ہوئیں اور نہ معیارات میں کوئی بنیادی ردوبدل کیا گیا، لیکن مادّی فراوانی اور حکمراں طبقے کی بے راہ روی نے اقدار کے مکمل ومسلّم نظام کو بڑی حد تک معطل کردیا اور دربار معاشرے کے بڑے حصے پر حاوی ہوگیا۔ صوفیا، علما اور مذہبی رہنماؤں کے اثرات معاشرے میں کم سے کمتر ہوگئے۔ قول وعمل کا تضاد ایک عام بات ہوگئی اور بلند اقدار کو زبانی خراج عقیدت پیش کرنا ایک فیشن بن گیا۔ اس عہد کا ادب معاشرے کی سطح پر بکھری ہوئی اشیا کی تصویر کشی بڑی دیانت داری سے کرتا ہے، لیکن معاشرے کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش نہیں کرتا۔ چنانچہ محبت کے تذکرہ سے تہہ نشیں حقائق سامنے نہیں آسکے۔ صرف اپنے قریب اور گردوپیش کے حقائق کو ہی قابلِ اعتنا سمجھتا ہے، معاشرہ کی دور دور تک پھیلی ہوئی جڑوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ چنانچہ قصبات و دیہی علاقوں کے آداب واطوار، رسوم اور مسائل ومشاغل اس کے کلام میں منعکس نہیں ہوتے۔''

قاضی عبدالستار کی چند نمائندہ کہانیوں کا پس منظر اودھ کی ثقافتی و تہذیبی زندگی اقداران کے زوال کا شدید ماتم ہے جن کی آبیاری میں تعلقہ دارانِ اودھ نے خاص رول ادا کیا تھا۔ اودھ میں تعلقہ داری کی روایت قدیم ادوار سے چلی آرہی تھی۔ تقریباً آٹھ سو سال قبل ملک کے تمام مقامات سے راجپوت آئے اور یہاں کی مقامی سیاسی قوتوں کو شکست دے کر حاکمانہ انداز سے یہاں آباد ہوگئے۔ اراضیوں کو چھوٹے چھوٹے تعلقوں کی شکل دے کر آپس میں تقسیم کرلیا اور اپنے اپنے علاقوں کے سردار بن گئے۔ انہی سرداروں کو بعد میں بابو، بھیا، ٹھاکر، راجہ یا تعلقدار کہا جانے لگا۔ شیخوں کے دورِ اقتدار میں بھی تعلقہ داروں کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ سعادت خاں، برہان الملک کے دور میں بھی اس خطے میں تعلقہ داروں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ نوابین اور سلاطینِ اودھ ان تعلقہ داروں پر بڑا ناز کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ جب ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کو انگریزی حکام کے احکام کے تحت ختم کردیا گیا تو واجد علی شاہ نے ۷؍فروری ۱۸۵۶ء میں تعلقہ داروں کو فرمان بھیجا:

''مابدولت نے آج کی تاریخ سے تم سب کو ایسٹ انڈیا کے حوالے کیا۔ تمھیں چاہیے کہ کمپنی مذکورہ کے احکام کی تعمیل کرواور اپنے تئیں ان کی رعایا سمجھو۔''

واجد علی شاہ کے بعد بھی ایک عرصے تک تعلقہ داروں کا دبدبہ قائم رہا۔ تعلقہ دارانِ اودھ جن کا دور نوابینِ اودھ کے عہد ۱۷۲۰ء سے شروع ہوتا ہے اور سلطنت برطانیہ کے زوال ۱۹۴۷ء تک رہتا ہے، اودھ کی تہذیب وتمدن اور فنون لطیفہ کے عروج کا زمانہ بھی یہی ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اودھ کی وہ تہذیب جس کی بدولت اودھ کو دنیا بھر کی ترقی پذیر اور ترقی یافتہ قوموں نے اپنی آنکھوں میں جگہ دی، اس کی شائستگی میں تعلقہ داروں نے ایک اہم کردار ادا کیا اور اودھ کی تہذیبی تاریخ ان کے بغیر مکمل طور پر پیش نہیں کی جاسکتی۔

قاضی عبدالستار کا وطن ضلع سیتاپور ہے جو شروع سے اودھ کی ریاست کا ایک حصہ رہا ہے اور وہ خود زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔

چنانچہ ان کی اکثر کہانیوں کا پس منظر اس خطے کی جیتی جاگتی تہذیبی اور سماجی زندگی، قومی ہم آہنگی اور اتحاد و اتفاق کے مناظر کا بڑا خوبصورت ڈرامائی انداز میں بیان ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا جاچکا ہے، ہندوستان میں برطانوی سامراج کے عروج کا زمانہ ہندوستان میں جاگیرداری کے دور کے خاتمے اور زوال کا زمانہ رہا ہے۔ چنانچہ پورے ملک میں دھیرے دھیرے انگریزوں کا تسلط قائم ہوتا چلا گیا اور مقامی جاگیرداروں کی حکومت اور شان وشوکت محدود سے محدود تر ہوتی چلی گئی۔

البتہ نواب واجد علی شاہ کی حکومت کا خاتمہ اس نظام کے تابوت میں آخری کیل کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے بعد اس پورے خطے میں دوبارہ ملوکیت کے پنپنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ ضرور ہے کہ اس خطے میں تعلقہ داری اور زمینداری کی جو روایت صدیوں سے چلی آرہی تھی اس کے نشانات کو یکسر مٹا دیا جانا ممکن نہ تھا اور یہ دور انگریزی حکومت کے اختتام تک کسی نہ کسی شکل میں باقی رہا اور جب ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوگیا اور جمہوری قوانین مرتب ہوئے تو اس کے بعد پھر کسی سامراجی نظام کے قائم رہنے کا جواز بھی باقی نہ رہا۔ لہٰذا کچھ ہی عرصے بعد ایک قانون کے تحت پورے ملک میں چلی آرہی صدہا سال پرانی زمینداری کی روایت کا خاتمہ ہوگیا، جس کا مقصد ملک میں لوگوں کو یکساں حقوق بہم پہنچانا اور مساوات قائم کرنا تھا، اس لیے کہ مساوات کو جمہوری نظام کی ایک خصوصیت اور اہم قدر سمجھا جاتا ہے۔ اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد رہی سہی زمینداروں کی حالت مزید ابتر ہوگئی۔ کچھ تو انگریزوں نے اپنی ظالمانہ کارروائیوں کے ذریعے ان نام نہاد جاگیردارانہ اداروں اور ان سے وابستہ افراد کو ذلیل وخوار کیا تھا، اور خصوصاً اودھ کے علاقے میں اس کے اثرات پوری طرح نمایاں بھی ہوچکے تھے، جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ جمہوری دور میں نئے قانون نے پوری کردی۔ وہ امرا و رؤسا اور شرفا جو اپنی سخاوت، دریادلی، نجابت، فیاضی اور دیگر انسانی خصوصیات کے لیے زمانے بھر میں شہرت رکھتے تھے اور جن کے گھروں پر ہمہ وقت ضرورت مندوں کا میلا لگا رہتا تھا، حتیٰ کہ گئے گزرے دنوں میں بھی یہ نام نہاد امرا، اپنی رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور تعاون وامداد کرنے سے باز نہیں رہتے تھے۔ نئے زمانے میں حالات کی ستم ظریفی نے انھیں اس مقام پر پہنچا دیا جہاں وہ خود دوسروں کے دست نگر بن گئے اور انھیں گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ تمام تر اپنی دیرینہ شریفانہ اور مہذب پہچان کے باوجود ایک ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے جس میں بیشتر کو دو وقت کی روٹی کا بھی محتاج ہونا پڑا۔ قاضی عبدالستار نے اپنی کہانیوں میں دراصل اسی طبقے کو موضوع بنایا ہے اور پہلی بار انسانی ہمدردی کی میزان پر ان کے دکھ درد کو تولنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ ہمارے علما اور مؤرخین نے اودھ کی سلطنت اور بادشاہت کے مسائل پر جب بھی قلم اٹھایا تو اس طبقے اور اس ادارے کی زندگی سے وابستہ گرمیٔ عیش ونشاط اور فراوانیٔ دولت و ثروت کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا کہ قاری نے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی کہ نوابین اور امرا بھی بالآخر انسان تھے۔ ان میں اگر کچھ انسانی کمزوریاں تھیں تو کچھ خوبیاں بھی ضرور رہی ہوں گی، اودھ کا معاشرہ جس کا مرکز شہر لکھنؤ تھا اس کے زیر اثر جو تہذیب اور ثقافت پروان چڑھی اور اس پورے عہد میں علم و ہنر کے متنوع میدانوں میں جو گراں قدر کارنامے انجام دیے گئے، ان کا احاطہ کرنا بھی آسان کام نہیں، لیکن حیرت ہے کہ ہمارے مؤرخین اور محققین نے اصلیت کا صرف ایک رخ یعنی اودھ کے حکمرانوں کی عیاشی اور زن وزر پرستی کے واقعات تو بیان کیے، لیکن اس گراں قدر تہذیبی وثقافتی منظرنامے پر روشنی نہ ڈالی جس کی بدولت سرزمینِ اودھ پورے ملک میں ممتاز اور منفرد تھی۔

قاضی عبدالستار کی کہانیوں کا کینوس ہر چند کہ اپنے فنی تقاضوں کے سبب اتنا وسیع نہیں ہے کہ اس میں اودھ کا پورا تہذیبی آفاق سما جائے بلکہ ان کی کہانیوں کا زمانی تناظر بھی جدید دور میں اودھ کے باقی ماندہ زمینداروں کی زبوں حالی سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ قاضی عبدالستار نے اپنی کہانیوں کے ذریعے جن تہذیبی اور شریفانہ اقدار کے زوال کا ماتم کیا ہے، ان کی جڑیں سرزمینِ اودھ کی تہذیبی تاریخ کی گہرائیوں میں پیوست ہیں اور ان کہانیوں کی داخلی زندگی اور واقعات کی صحیح تفہیم بدلتی ہوئی تاریخ کے دریچوں میں جھانکے بغیر ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے لیے یہ جاننا ازحد ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ کون سی تہذیبی اقدار تھیں جن کو بالعموم نظرانداز کیا گیا اور جنھیں جانے بغیر قاضی عبدالستار کے افسانوں کی معنویت کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ اس سلسلے میں یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اودھ کے حکمرانوں کی توجہ بالعموم ادب، شاعری اور فنون لطیفہ کی طرف رہی، جس کی پرورش اور پرداخت میں حکمراں طبقے کے ہر صاحبِ کمال نے حسب توفیق حصہ لیا۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم تھے۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جس مشترکہ قومی تہذیب کی ضرورت پر آج ہمارے مفکر اور دانش ور زور دے رہے ہیں، اس کی بہترین مثال اودھ کے علاقائی ادب میں آج بھی موجود ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں یہ تصور لوگوں کے ذہنوں میں کس قدر واضح اور صاف تھا اور یہی وجہ ہے کہ سبھی لوگوں نے مل کر ایک خوبصورت

اور دل نشیں تہذیبی قلعہ تعمیر کیا تھا جسے 'تہذیب اودھ' کہتے ہیں۔ اس تہذیب نے جن ادبی، فنی اور جمالیاتی امور کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ان میں ادب و شعر کی تمام اصناف شامل ہیں۔ جن میں داستانیں، مرثیے، مثنویاں، غزلیں، ڈرامے اور اسی کے ساتھ ساتھ موسیقی اور رقص غرض کہ سبھی کچھ شامل ہے۔ ان اوصاف کے تذکرے سے محض کچھ علمی اور ادبی ناموں اور کاموں کی کھتونی بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ان فاضلانہ علمی کاوشوں کے ذریعے وہ کون سی سماجی، معاشرتی اقدار تھیں جو اس گئے گزرے زمانے میں بھی محترم اور وقیع تھیں جن کو باقی رکھنے اور آگے بڑھانے کا جتن کیا گیا۔ چنانچہ وہ تمام اقدار جو انسان کو شرفِ انسانیت سے ہمکنار کرنے والی کہی جاسکتی ہیں، بلا تخصیص ان ادوار سے متعلق جملہ علمی و ادبی کاوشوں میں موجود ہیں۔ بے شک کچھ لہو و لعب اور فحاشی و جنسیت زدگی بھی مل جاتی ہے جن کی جانب حالی نے بھی اشارے کیے ہیں، جو اس عہد کے ادبی مزاج کا ایک حصہ بن گئی تھیں۔ تاہم اس عہد کا بڑا حصہ احترامِ آدمیت اور خیر کثیر سے عبارت ہے اور یہ وہ برکات ہیں جن کا فیضان آج بھی جاری ہے۔

ایسا سمجھا جاتا ہے کہ اس عہد کے شاعروں اور ادیبوں کا تصور اس قدر ناقص تھا کہ وہ خواتین کی پوری شخصیت کا عرفان کرنے سے قاصر تھے، ممکن ہے کسی حد تک یہ بات صحیح ہو، اس لیے کہ اس وقت تک عورت کا معاشرہ بالعموم دو حصوں میں منقسم تھا یعنی گھریلو عورت اور بازاری عورت۔ بے شک اس عہد کی شاعری کا موضوع عام طور پر بازاری عورت ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس بازاری عورت کی بھی شخصیت کا صرف ایک ہی پہلو سامنے آتا ہے، جو کہ خارجی ہے۔ اس کی داخلی زندگی، اس کے ذاتی آشوب کا عرفان ہماری ادبیات میں شاذ ہی ملے گا۔ تاہم ایک مثالی اور قابلِ تقلید عورت کی، جس میں ماں، بہن، بیٹی، خالہ، پھوپھی وغیرہ شامل ہیں، اس عہد میں لکھے گئے مرثیوں میں جس طرح کی تصویر ابھری ہے اور ان رشتوں کی پاکیزگی اور طہارت جس طرح ملحوظ رکھی گئی ہے، اس کی مثال کسی دوسری جگہ کم ہی مل سکے گی۔ اس عہد میں لکھی گئی داستانوں کے ذریعے جن اخلاقی اور روحانی بلندیوں تک پہنچنے اور پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی بھی مثال مشکل سے مل سکے گی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانا شاید غلط نہ ہو کہ اس دور میں جب کہ معاشرے کی اقتصادی بنیادیں قدرے مضبوط اور سماجی نظام کافی حد تک مستحکم تھا تو اس کی توانائی اور پختگی کا دار و مدار کسی نہ کسی طرح ان بنیادی سماجی سچائیوں اور اخلاقی تصورات پر تھا جو اس عہد کے مخلص فنکاروں کے علم و یقین کا حصہ تھے۔

شعر و ادب اور فن و موسیقی بجائے خود ایک مہذب معاشرے کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ آزادانہ غور و خوض اور طبعی مناسبت کے ذریعے ادب و شعر کی تخلیق کے لیے ایک عام فضا جو ان دنوں موجود تھی اور جس میں رہ کر اہم دل چسپ اور کارآمد موضوعات پر اتنا کچھ لکھا گیا کہ آج ایک سرمایۂ کثیر ہماری دسترس میں ہے، وہ اسی صورت میں ممکن ہوا کہ جاگیردارانہ ادوار میں بھی اہلِ قلم آزادی کے ساتھ اپنی بات کہنے اور سننے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

بظاہر ان ادبی اور جمالیاتی کاوشوں کے ڈانڈے مادّی اور دنیوی فوائد سے گرچہ کم ملتے ہیں، لیکن ان جمالیاتی افکار کے ذریعے انسانی روح کی سیرابی کا جو سرچشمہ میسر آیا ہے، اس کی اہمیت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے۔ ان ادوار میں شاہی سرپرستی میں ادب و شعر کے ماسوا رقص و موسیقی کو بھی کافی عروج حاصل ہوا جسے خالص اسلامی اور مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ممکن ہے ان کی افادیت مشتبہ ہو، لیکن فنی و جمالیاتی اور خصوصاً تہذیبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب چیزیں بے وقت کی راگنی نہ تھیں بلکہ کچھ خاص معاشرتی اور انسانی مقاصد کے حصول کا ذریعہ معلوم ہوتی ہیں جن کے نمونے واجد علی شاہ کے زمانے میں سب سے زیادہ ملتے ہیں۔ موسیقی اپنی تاثیر کے اعتبار سے ہر دور میں انسانوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا مؤثر ترین حربہ رہی ہے۔ بلکہ یہ وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسانی قلوب منقلب و مسخر کیے جاسکتے ہیں۔ اودھ کے حکمرانوں کو اگر رقص و موسیقی عزیز تھی تو کچھ تعجب نہیں کہ اس کے ذریعے ان کا مقصد معاشرتی استحکام اور تہذیبی رنگارنگی کو فروغ دینا ہو، جس کی ضرورت سے انکار ناممکن ہے۔ ہمارے ملک کی بعض مذہبی ضرورتیں بھی رقص و موسیقی سے وابستہ رہی ہیں جن کو نظر انداز کر کے کوئی حکمراں جماعت سیکولر تہذیبی روایات کی علم برداری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ چند قابل ذکر خصوصیات اور اقدار اور بھی ہیں، جو اودھ کی جاگیردارانہ تہذیب سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں کچھ تفریحی مشاغل و مرغوبات کے علاوہ ہماری قدیم مشترکہ ثقافت اور معاشرتی امتزاج کی مثالیں مل جاتی ہیں جن کا تذکرہ مشترکہ رسم و رواج کے حوالے سے ادب و شعر کی کتابوں میں محفوظ چلا آرہا ہے۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس نے صحیح مذہب و ملت، رنگ و نسل سے وابستہ تمام ذہنی تعصّبات سے بلند ہو کر ایک مثالی ہندوستانی معاشرتی زندگی کا نقشہ پیش کیا، جو اپنی کشش اور افادیت کے سبب آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اودھ کے حکمرانوں نے جس تہذیبی اختلاط کی پرورش کی اور اپنی سرپرستی کے ذریعے پورے خطے کو ہر دور میں 'گہوارۂ امن' بنائے رکھا، اس

کے سبب سے اودھ کے خطے کی حیثیت پورے ملک کے پس منظر میں ایک گھنے اور ہرے بھرے 'شجر سایہ دار' کی رہی ہے، جس کے نیچے بیٹھ کر مسافر سکون کا سانس لیتا رہا ہے۔ میری مراد یہاں ملک کے مختلف حصوں سے ہجرت کر کے اودھ کی سرزمین میں پناہ پانے والے ان ہزار ہا ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے ہے، جو ملک کے دیگر حصوں کی بدامنی اور انتشار اور فن کی ناقدری سے پریشان ہو کر نواحِ لکھنؤ میں آباد ہو کر فخر محسوس کرتے تھے جہاں بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان کا اکرام ہوتا تھا اور ہنر کی داد دی جاتی تھی۔ کیا ایسے اور اس سے مماثل دوسرے واقعات سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اودھ کی تہذیب ہر زمانے میں زندگی کے بعض اعلیٰ مقاصد کی جستجو میں رہی ہے اور کم مایہ اور حقیر مقاصد کے لیے تگ و دو کرنے کے بجائے کچھ عظیم اور لازمانی کارنامے انجام دینے کی فکر کرتی رہی ہے۔

اودھ کے گاؤں اور دیہات کے پس منظر میں لکھے گئے قاضی عبدالستار کے افسانوں کے مطالعے سے دو امور بالخصوص سامنے آتے ہیں۔ ان کا تعلق پورے ملک میں بالعموم زمینداری کے خاتمے سے پیدا ہونے والے لاتعداد سماجی اقتصادی اور دوسرے مسائل سے ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کا تعلق اودھ کے دور میں پرورش پانے والی تہذیبی اقدار اور سیکولر تصورات کے بتدریج خاتمے اور ان کی جگہ پر کسی نئے اخلاقی ضابطے اور اصولی نظام کے نہ ابھر سکنے کے غم سے بھی ہے — جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اودھ کے حکمرانوں کی کوششوں سے ایک ایسا انسانی معاشرہ وجود میں آیا تھا جو صحیح معنوں میں اپنے اندر ہندوستانی خصوصیات رکھتا تھا۔ اس کے قومی اور وطنی جذبات میں جس نوع کی پختگی سچائی اور خلوص تھا اس کا اظہار آزادیٔ وطن کی کش مکش کے دوران بیگم حضرت محل کی قیادت میں ہوا۔ البتہ دھیرے دھیرے نہ جانے کن اثرات کے تحت یہ برگزیدہ احساسات اور مخلصانہ قومی جذبات سرد پڑتے چلے گئے اور آج ہم جن واقعات سے دوچار ہیں، وہ زوال اور انحطاط کی انتہائی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں ایک طرف اودھ کی تہذیب سے وابستہ بعض کمزوریوں اور خرابیوں کو نشان زد کیا جائے، وہیں اس تہذیب کی گود میں پروان چڑھنے والی ان دل نشیں قدروں اور حقائق کو بھی سامنے لایا جائے، جس کی پامالی کا قاضی عبدالستار کو بجا طور پر غم ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے ان اقدار کی جستجو کرنی چاہیے، جو اودھ کی حکومت کے زوال کے بعد اس کے تہذیبی ملبے میں دب کر برباد ہو گئیں اور آج محض ان کی یادیں باقی رہ گئی ہیں جن کے وسیلے سے ایک گم شدہ زندگی ہمارے ذہنوں میں ایک فلم کی صورت میں ڈوبتی اور ابھرتی رہتی ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مرقع اس عہد کی ادبی کاوشوں میں بڑی مرصع کاری کے ساتھ موجود ہیں اور ان موضوعات کے حوالے سے آج بھی اودھ کی گزشتہ تہذیبی تاریخ رقم کرنے کی کوششیں جاری ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد میں خالص مذہبی رسوم اور تقریبات بھی مشترکہ قومی کلچر کے فروغ کا ذریعہ بن گئی تھیں جس میں مسلم اور ہندو دونوں مذہبی تقریبات اور تیوہار شامل ہیں۔ اس تذکرے کی ضرورت آج اس وجہ سے زیادہ معنی خیز ہو جاتی ہے، کہ ہمارے زمانے میں تطہیر Purification پر اتنا زور ہے کہ لوگوں نے ایک دوسرے کی مذہبی تقریبات میں شرکت کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اودھ کے دورِ حکومت میں تیوہاروں کی حیثیت ایک بڑے تقریبی Events کی تھی جس میں عوام اور خواص بلاتخصیص مذہب و ملت بڑی خوشی اور گرم جوشی سے شرکت کرتے تھے اور اس طرح آپسی محبت اور تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہتا تھا۔

اودھ کے حکمراں تو اس قدر صاف اور سیکولر ذہن کے مالک تھے کہ خاص ہندو تیوہاروں ہولی، دیوالی اور دسہرا وغیرہ اکثر ان کی نگرانی میں اور حکومت ہی کے خرچ پر منائے جاتے تھے۔ ان تیوہاروں کی رونق بادشاہ کی شرکت سے دوبالا ہو جاتی تھی۔ اس موقع پر اکثر پورا لکھنؤ سجایا اور سنوارا جاتا تھا۔ رات میں آتش بازی اور چراغاں کے مناظر اور دن میں عمائدین شہر کا ایک دوسرے کے گھروں پر جا کر مبارک باد پیش کرنا، سلامتی اور خیر سگالی کے کلمات ادا کرنا ایسے دل نشیں سماجی فریضے تھے جو آج کے ادوار میں محض خواب معلوم ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں نے اور اودھ کے مسلم حکمرانوں نے ہندو تیوہاروں کو اپنا لیا تھا بلکہ خود ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کے مذہبی تیوہاروں کو پوری محبت اور عقیدت کے ساتھ اختیار کر لیا تھا اور حد یہ ہے کہ آج کے گئے گزرے زمانے میں بھی اس کی کچھ مثالیں مل جاتی ہیں۔

چنانچہ تقریباتِ محرّم جنھیں خاص طور پر مسلمانوں میں شیعی فرقے کا ایک مذہبی فریضہ تصور کیا جاتا ہے اور اودھ کے حکمراں جو بالعموم شیعہ عقیدے پر کاربند تھے۔ محرم بڑے احترام و عقیدت سے مناتے تھے جس میں ہندو بہت بڑی تعداد میں نہ صرف شریک ہوتے تھے، بلکہ وہ خود اپنے طور پر بھی یہ رسم مناتے تھے۔ اپنے گھروں میں تعزیے اور علم رکھتے تھے، سبیل لگاتے اور محرم کے خاص دنوں میں شادی بیاہ سے گریز کرتے تھے وغیرہ.....

احترام آدمیت اور شرافت کی یہ وہ مثالیں ہیں جن پر اودھ کی تہذیبی اقدار کا قلعہ تعمیر ہوا تھا۔ ہندو شرفا نے وہ تمام خارجی و باطنی تہذیبی

خصوصیات اپنے اندر جذب کر لی تھیں، جن کا تعلق غذا، لباس، مذہبی اور غیر مذہبی رسموں اور تقریروں سے تھا۔ حد یہ ہے کہ شادی بیاہ کے رسوم کچھ اس طرح کے تھے کہ دونوں میں فرق اور امتیاز کرنا بہت مشکل تھا۔ خصوصاً لباس میں تو اس قدر مماثلت تھی کہ کوئی شخص بہ مشکل ایک دوسرے کی مذہبی شناخت کر سکتا تھا۔ ہولی اور دیوالی، میں مسلمان حکمراں طبقے اور مسلم عوام کی شرکت سے جو رنگ آمیزی ہوتی تھی، وہ نا قابل بیان ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان تیوہاروں میں مسلمان شریک ہوتے تھے بلکہ خود بھی اپنے طور پر ان کو منانے کا اہتمام کرتے تھے۔ ثقافتی پروگرام مثلاً ناچ گانے بجانے کی محفلیں خاص عوامی ذوق کا مظہر ہوتی تھیں جن میں سبھی لوگ عورت، مرد، بوڑھے، بچے بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ مشہور ہے کہ آصف الدولہ اور سعادت علی خاں ہولی کے موقع پر جس فیاضی کا مظاہرہ کرتے تھے جیسا کہ میر تقی میر (ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر) اور شیر علی افسوس کی مثنویوں میں درج ہے۔ اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس موقع پر رنگا رنگ تقاریب ہوتی تھیں، درباریوں کو قیمتی خلعتیں، نقدی اور قیمتی زیورات دیے جاتے تھے اور ہولی کے موقع پر گلال، عبیر، اور زعفران سے بھری پچکاریاں پورے ماحول کو محبت کے رنگ میں رنگ دیتی تھیں۔ شام کو چراغاں اور آتش بازی کا اہتمام ہوتا تھا۔ بسنت کا تیوہار بھی ہندو اور مسلمان دونوں میں مقبول تھا۔

آصف الدولہ کے دربار میں اس جشن کا بھی بڑا اہتمام ہوتا تھا کہ لوگ زرد لباس پہن کر شہر کے باہر زرد رنگ کی پتنگیں اڑانے کا اہتمام کرتے تھے۔ گانے اور ناچنے والوں میں ہندو، مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے، دسہرا بھی اس عہد میں ہندو مسلم یک جہتی کی علامت بن گیا تھا۔ اکثر مسلمان 'نیل کنٹھ' کا درشن کرنے کے لیے مندروں میں جاتے تھے بلکہ شہر کا حاکم اپنے گھوڑے اور ہاتھیوں کو مہندی اور دوسرے رنگوں سے سجا کر پورے ساز و سامان، فوجی دستے اور مصاحبوں کے ساتھ مندروں میں 'نیل کنٹھ' کا درشن کرنے جاتا تھا۔

اس موقع پر مٹھائیاں تقسیم ہوتی تھیں اور دعوتوں کا عام اہتمام ہوتا تھا جس میں سبھی مذاہب کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ ہندو تیوہاروں کی مسلمانوں میں جو مقبولیت تھی، اس کی مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا بیان بھی مشکل ہے۔ یہی حال اودھ کے ہندوؤں کا بھی تھا جو مسلمانوں کے مذہبی رسوم میں عام دل چسپی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ خصوصاً صوفی سنتوں اور بزرگوں کے مزاروں پر مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی لاکھوں کی تعداد میں شریک ہو کر 'قومی اتحاد' اور آپسی محبت کا ثبوت دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ مذہبی رواداری اور عقیدت و احترام کی جس روایت کی بنیاد اس عہد میں پڑی تھی اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور اب بھی میلوں ٹھیلوں میں مسلمان زائرین کے مقابلے میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ حد یہ ہے کہ عید، بقرعید، جو مسلمانوں کے خاص مذہبی تیوہار ہیں، ان میں بھی اودھ کے زمانے میں ہندوؤں کی شرکت کی گنجائش اس طرح نکالی گئی تھی کہ شام میں عید ملن، اور بقرعید ملن، کے پروگرام ہوا کرتے تھے۔ جس میں ہندو دوستوں کی تواضع اور ضیافت کا خاص انتظام ہوتا تھا۔ عید کے روز شیرینی اور سویوں کا خاص اہتمام بھی فرماں روائے اودھ ہی کی دین ہے۔ پان، عطر اور پھول پیش کرنے کا رواج تھا جس کی ادائیگی میں بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا۔ عید کے دن اودھ کے حکمراں ایک شاندار جلوس کے ہمراہ نماز ادا کرنے جاتے تھے، جس میں ہزاروں لوگ گھوڑے پر سوار، پیدل چلنے والے فوجی اونٹوں پر بیٹھے ہوئے بندوقچی، توپ خانے اور ہاتھی گاڑی شامل ہوتے تھے۔ یہ جلوس جو بجائے خود ایک بہت بڑے Event کی حیثیت رکھتا تھا اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ شب برأت اور دیوالی کی رسمیں بھی تقریباً ایک ہی انداز سے منائی جاتی تھیں۔ خصوصاً آتش بازی اور چراغاں جو دونوں میں مشترک تھا ہندو مسلمان بڑے شوق سے ان کا اہتمام کرتے تھے۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ محرم کی مجلسوں اور جلسوں میں ہندوؤں کی عقیدت اور احترام کے ساتھ شرکت اودھ کے زمانے میں شروع ہوئی تھی، وہ سلسلہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے۔ چونکہ ان تمام موقعوں کی حیثیت عوامی انداز لیے ہوئے ہوتی تھی، اس لیے اس کی تمام تر شان و شوکت اور کامیابی کا دار و مدار ہندو مسلم عوام کی کثیر تعداد میں شرکت پر تھا۔ واجد علی شاہ محرم کا چاند دیکھنے کے بعد سبز لباس پہن لیتے تھے۔ عاشورہ کی شب وہ لوگوں کے گھروں میں جا کر تعزیہ خانوں کی زیارت کرتے اور چڑھاوا چڑھاتے تھے۔ اکثر جلوس میں خود تاشا بجاتے تھے۔ اس موقع پر فقیر اور جوگی بننے کا عام رواج تھا جس میں ہندو اور مسلم دونوں شریک ہوتے تھے۔ ان ادوار میں مہندی کا جلوس شاہانہ انداز سے اٹھتا تھا جس میں بادشاہ خود شریک ہوتا تھا۔ ہاتھیوں اور گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے پاپیادہ چلنے والے ہزاروں لوگ جشن میں شریک ہوتے تھے۔ امام باڑے کے اندر داخل ہونے والے سامان میں چاندی کی کشتیوں میں مٹھائیاں، خشک میوے اور پھولوں کے ہار ہوتے تھے۔ دلہن کی نقرئی پالکی کے ہم راہ خوبصورت وردیاں پہنے مشعلچی قمقموں میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے ساتھ قرنا اور نقیری بجانے والوں کی چوکی ہوا کرتی

تھی۔اس پالکی پر سے روپے اور چاندی کے سکے نچھاور کیے جاتے تھے۔ کچھ لوگ حضرت قاسم کا تابوت کاندھے پر اٹھائے اور کچھ لوگ ماتم کرتے جاتے تھے۔اس تابوت کے ہم راہ گھوڑا ہوتا تھا،جس پر حضرت قاسم کا عمامہ،خنجر،کمان اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش رکھا رہتا تھا۔جب یہ گھوڑا امام باڑے کے صحن میں داخل ہوتا تھا تو اس پر سے سونے اور چاندی کے پھول نچھاور کیے جاتے تھے۔ مہندی کی یہ رسم خالص ہندوستانی تھی۔جس کا دنیائے عرب میں کوئی تصور نہیں ملتا۔اس لیے کہ وہاں شادی بیاہ کی رسموں میں اگر سادگی ہے تو ہندوستان میں بڑی رنگارنگی اور دل کشی ہے۔

اودھ کی تہذیبی زندگی تہذیبی اختلاط اور امتزاج کی یہ محض چند مثالیں ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ ایک صدی سے زائد تک پروان چڑھنے والی تہذیبی زندگی اور اس کے گوناگوں مظاہر ایک ایسی داستان کی حیثیت رکھتے ہیں، جو سچے اور حقیقی واقعات و کردار پر محیط ہونے کے باوجود ایک خواب خیال اور طلسماتی حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔ بہرنوع یہ وہ چند در چند تہذیبی اقدار اور اخلاقی وانسانی کردار کی لازمانی مثالیں ہیں، جو اودھ میں ایک عرصے تک پروان چڑھتی رہیں۔حکومت اور عوام کی سطح پر ان کی سرپرستی اور پذیرائی ہوتی رہی، جن کی بدولت اودھ کے فرماں روا ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کا اور ہندوستان کے مجموعی حافظے کا ایک ناگزیر حصہ بن گئے،لیکن افسوس کہ بتدریج ان عظیم قدروں کا زوال ہوتا چلا گیا۔اس کے اسباب ظاہر ہیں کہ جب سرپرستی اور پذیرائی کا فقدان ہوتا چلا گیا تو ماحول پر ایک عام تاریکی کا پھیل جانا ناگزیر تھا۔اودھ کی تہذیبی زندگی کے زوال کی جو ابتدا 'واجد علی شاہ' کے اچانک سیاسی اقدار کے خاتمے سے شروع ہوئی تھی اسے پھر کہیں رک کر سانس لینے کا موقع نہ مل سکا۔ یکے بعد دیگرے ابتلا اور آزمائش کے ادوار آتے رہے اور بالآخر ہندوستان کی آزادی کے کچھ عرصے بعد زمینداری کے خاتمے کے ساتھ اودھ کی تہذیبی زندگی ایک ایسی بھیانک تاریکی میں ڈوب گئی جس کو پھر کبھی ابھرنا نصیب نہ ہوسکا۔ جمہوری اداروں اور جمہوری اقدار کے فروغ کے زمانے میں ایک سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ شرافت اور انسانیت ناپنے کا کوئی پیمانہ باقی نہ رہ گیا۔تقدیر کے ہاتھوں کل کے امراو رؤسا اور شرفا آج ذلت و خواری، افلاس اور غربت کی ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے جن کے تصور سے جی لرز اٹھتا ہے۔اس دور میں سامراجی اداروں سے وابستہ افراد اور اشخاص پر جو کچھ گزری، اس سے زیادہ المناک بات یہ ہے کہ نئے زمانے میں انسان یکسر بے چہرہ ہوگیا۔ کل تک جو میزان عدل وانصاف،شرافت ونجابت،حق اور ناحق تھی، وہ آج بالکل بدل گئی اور ایک ایسے قانون کی حکمرانی ہوگئی جس کے تحت انسان کا قد بہت چھوٹا ہوگیا۔اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہا۔ وہ ایک بے نام منزل کی طرف جانے کے لیے مجبور ہوگیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔قاضی عبدالستار کی کہانیوں میں اسی انسان اور اس کے ماضی وحال کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ہم ان کہانیوں کی مدد سے ان پرچھائیوں کو پکڑنے کی جستجو کرتے ہیں، جو آج کسی طرح ہماری دسترس میں آنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

◆◆◆

## قارئین سے گزارش

اردو اکادمی، دہلی سے شائع ہونے والے رسالے 'بچوں کا ماہنامہ امنگ' اور 'ایوانِ اردو' دہلی اپنی مقبولیت کے سبب ہندوستان کے گوشے گوشے تک پہنچتے ہیں،لیکن پھر بھی بعض لوگ شکایت کرتے ہیں کہ انھیں رسالہ نہیں ملا۔وہ پہلے اپنے ڈاک خانہ سے رجوع کریں اور اپنا اندراج نمبر اور پتا چیک کرائیں۔ساتھ ہی اپنے احباب اور متعلقین کو دونوں رسالوں کے خریدار بنائیں۔تاکہ اردو کے فروغ میں آپ کی بھی حصّہ داری ہوسکے۔

## توجہ طلب

- قلمکار حضرات اپنی تخلیقات کے ساتھ اپنا پاس بک میں درج نام انگریزی میں اسپیلنگ کے ساتھ ضرور لکھیں۔اپنا مکمل پتا، پن کوڈ اور رابطے کے لیے فون نمبر بھی ضرور درج کریں۔
- قلمکاروں سے ایک گزارش اور ہے کہ بذریعہ ای۔میل اپنی تخلیقات بھیجنے سے قبل اپنی تخلیقات کو ایک بار ضرور پڑھ لیں تاکہ اس میں پروف کی غلطیاں کم سے کم رہیں۔

—ادارہ